پاکستان اور جمہوریت۔ایک فکر انگیز مراسلہ (آخری قسط)

حرفِ تمنا

☆☆☆☆☆

ارشاد احمد حقانی

تحریک عدل کے چیئرمین اور کراچی کے ایڈووکیٹ سید فیروز شاہ گیلانی کا مراسلہ آپ کل ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ ان کے پہلے خط کے جواب میں میں نے ان سے دریافت کیا تھا کہ آپ پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) اور ان کی جلاوطن قیادت سے جمہوری کلچر کے فروغ میں مددگار ہونے کی توقع نہیں کرتے تو کیا آپ کسی فوجی حکومت یا مسلم لیگ (ق) یا کسی اور سے اس طرح کی توقع کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں وہ فرماتے ہیں: ''پاکستان میں جمہوریت اور قانون کی حکمرانی قائم کرنے کے لئے میں اس وقت کسی بھی شخص یا جماعت کا نام نہیں بتا سکتا۔ ق لیگ سے کوئی امید نہیں کی جا سکتی..... رہا فوجی حکمران کا معاملہ تو کوئی فوجی بھی جمہوریت اور قانون کی حکمرانی قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا''۔ گیلانی صاحب نے میرے استفسار کا مذکورہ جواب دے کر یہ تسلیم کر لیا ہے کہ اس وقت پاکستان میں جمہوریت اور قانون کی حکمرانی قائم کرنے والی کوئی قوت یا شخصیت موجود نہیں۔ میرا کہنا یہ ہے کہ درپیش حالات میں پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) جمہوریت اور قانون کی حکمرانی کے لئے جدوجہد کے حوالے سے دوسروں سے نسبتاً بہتر پوزیشن میں ہیں۔ گیلانی صاحب بوجوہ ان سے بھی اس طرح کی کوئی توقع نہیں رکھتے۔ پھر کیا ہو؟ کیا ہم مایوس ہو کر بیٹھ جائیں؟ گیلانی صاحب کا جواب ہے: (1) ہمیں متوسط طبقے کے پڑھے لکھے عوام دوست لوگوں سے استفادہ کرنا چاہئے۔ یہ لوگ تھنک ٹینکس بنائیں اور تفصیلی تحقیقات کے بعد حکومت اور اسمبلیوں کو بلا معاوضہ مشاورت فراہم کریں۔ (2) ان کا دوسرا جواب یہ ہے کہ پاکستان میں یا تو مغربی اور یورپی ممالک کے طرز پر پارلیمانی جمہوریت قائم کی جائے اور یا پھر امریکی طرز کی صدارتی جمہوریت۔ میں گزارش کروں گا کہ پاکستان میں اس کے سیاسی نظام کے بارے میں بحث و گفتگو پہلے ہی تفصیل سے ہو رہی ہے، اس نے رسمی تھنک ٹینکس کی بھی کچھ کچھ شکل اختیار کر رکھی ہے جبکہ غیر رسمی غور و فکر ہمہ وقت جاری ہے جس میں پاکستان کا پریس بھی مسلسل ایک اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ زیر نظر کالم اور اس میں ہونے والی بحث بھی ایک طرح کا تھنک ٹینک ہی ہے جو وہی کام کر رہا ہے جس کی ضرورت گیلانی صاحب ظاہر کر رہے ہیں۔ یہ کام جاری ہے اور جاری رہے گا اور یقیناً پاکستان میں جمہوریت اور قانون کی بالادستی قائم کرنے کی راہ اس سے ہموار ہوگی۔ جہاں تک برطانیہ، آسٹریلیا، فرانس، جرمنی، جاپان جیسے جمہوری ممالک سے راہنمائی لینے کا تعلق ہے، یہ عمل بھی پہلے سے جاری ہے لیکن یاد رکھئے کہ یہ ممالک اپنے موجودہ مقام پر دو چار روز میں نہیں پہنچے اس کے پیچھے صدیوں کی جدوجہد ہے جس سے اہل علم آگاہ ہیں۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ جنوبی ایشیا سے تعلق رکھنے والے ایک مہمان نے لندن میں اپنے میزبان کے گھر میں ایک خوبصورت لان دیکھا جس میں بہت اچھا گھاس اُگا ہوا تھا۔ مہمان نے پوچھا آپ نے اس قدر سبز، چمکدار اور گنجان گھاس کیسے اُگایا۔ برطانوی میزبان نے جواب دیا اس گراؤنڈ کی دیکھ بھال اور پرداخت 300 سال سے کی جا رہی ہے تب اس معیار کا گھاس یہاں نظر آ رہا ہے۔ گیلانی صاحب خود لکھتے ہیں کہ چارلس اوّل کی موت کے بعد جب کرامویل نے مثالی جمہوری راستہ ترک کیا تو اس کی قوم نے اس کی موت کے بعد اس کی ہڈیاں قبر سے نکال کر انہیں لٹکا دیا۔ اب یہ واقعہ 300 سال سے بھی زیادہ پرانا ہے جبکہ ہمارے ہاں تو پچھلے تیس چالیس سال میں بھی آئین توڑنے والے کو نہ صرف کوئی سزا نہیں دی گئی بلکہ انہیں فوجی اعزاز کے ساتھ دفن کیا گیا ہے تو ہم اس وقت آخر کس طرح برطانیہ، جرمنی، فرانس، آسٹریلیا وغیرہ کی پیروی کر سکتے ہیں۔ ہاں ہم انہیں ایک آئیڈیل کے طور پر سامنے ضرور رکھ سکتے ہیں لیکن جدوجہد ہمیں خود کرنی پڑے گی اور اس کا طریقہ تدریجی ارتقائی عمل کے سوا کوئی اور نہیں۔ ہندوستان کا ذکر اس لئے کرنا پڑتا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ آزاد ہوا اور ہمارے اور اس کے حالات میں کئی حوالوں سے گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ ہندوستان میں جمہوریت اور قانون کی حکمرانی کے تقاضے پورے نہیں ہو رہے تو وہاں بھی اصلاح ایک تدریجی عمل ہی کے ذریعے ہوگی۔ پاکستان کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے ہندوستان کا حوالہ دینا بات کو واضح کرنے میں مدد گار ہوتا ہے۔ تمام تر خرابیوں کے باوجود یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جمہوریت اور قانون کی حکمرانی کے حوالے سے ہندوستان کی حالت ہمارے مقابلے پر کسی نہ کسی درجے میں ضرور بہتر ہے۔ چونکہ گیلانی صاحب نے لکھا تھا کہ ہمارے ہاں جب تک فیوڈل ازم کا غلبہ ہے اور موجودہ سماجی اور اقتصادی ڈھانچہ برقرار ہے عوام کے جذبات کی ترجمان پارلیمنٹ وجود میں نہیں آ سکتی۔ جس پر میں نے عرض کیا تھا کہ ہمیں موجود خرابیوں کو دور کرنے کے لئے جدوجہد کرنی پڑے گی۔ ہاں فوری اصلاح کی ایک شکل یہ ہو سکتی ہے کہ کسی معجزے کے نتیجے میں حضرت یوسفؑ کی طرح کوئی پاکباز شخصیت پاکستان میں اقتدار پر فائز ہو جائے اور وہ بیک جنبش قلم جمہوریت کے فروغ کی راہ میں حائل رکاوٹیں دُور کر دے۔ اس قسم کی تبدیلی کے ظہور کو میں نے ''مردے از غیب'' کی آمد سے تعبیر کیا تھا۔ کہنا میں یہ چاہ رہا تھا کہ چونکہ عام حالات میں اس طرح کے معجزے نہیں ہوتے اس لئے ارتقائی اور تدریجی عمل اور جدوجہد کے بغیر چارہ نہیں۔

جہاں تک امریکی طرز کے صدارتی نظام کو اپنانے کا تعلق ہے میں بڑے ادب سے عرض کروں گا کہ اس نظام کو اپنانے اور چلانے کے لئے پارلیمانی نظام کے لئے مطلوب جمہوری پختگی سے بھی کہیں زیادہ جمہوری بلوغت کی ضرورت ہے۔ امریکی نظام چلانا برطانوی نظام سے کہیں زیادہ سیاسی اور جمہوری شعور اور پختگی کا مطالبہ کرتا ہے۔ آپ کسی فرمان کے ذریعے آج پاکستان میں امریکی طرز کا صدارتی نظام رائج کر دیں اگلے ہی دن ہم کسی آئینی ڈیڈ لاک کی گرفت میں آ جائیں گے اور اپنے پورے حکومتی ڈھانچے کو تعطل کی گرفت میں دے دیں گے۔ کسی دور دراز انجانی دیار سے کوئی پودا اٹھا کر آپ دوسری جگہ لگا دیں جہاں اس کے لئے سازگار آب و ہوا اور زمین موجود نہ ہو تو وہ پودا پھلے پھولے گا نہیں، بہت جلد مرجھا جائے گا۔ پارلیمانی نظام کی تو ہمیں کچھ معمولی شُد بُد ہے اور ہمارے سیاستدان قدرے ہوشمندی کا مظاہرہ کریں تو اس کو چلا سکتے ہیں۔ امریکی صدارتی نظام میں تحدید و توازن کے اتنے پیچیدہ ضابطے ہیں کہ ہم جیسی قانون اور آئین شکن قوم کے اس کو کامیابی سے چلا سکنے کا دور دور تک کوئی امکان نہیں۔

پاکستان کی سیاسی صورتحال اور اس کی سیاسی قیادت کی استعداد کے حوالے سے میری یہ رائے ہے کہ غلطیوں اور حماقتوں کے ارتکاب کے بعد اب ہماری سیاسی کلاس نسبتاً پختگی کے دور میں داخل ہو رہی ہے جس کا صرف ایک ثبوت یہ ہے کہ پاکستان کی تاریخ میں کسی فوجی حکمران (ایوب اور ضیاء الحق) کو سیاسی عناصر کی اتنی وسیع اور موثر مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑا جتنا پرویز مشرف کو کرنا پڑ رہا ہے۔ مذکورہ دونوں فوجی ادوار میں قریب قریب تمام سیاسی عناصر نے فوجی صدور کی چھتری کے نیچے پناہ لے لی تھی۔ ایوب اور ضیاء کے ادوار کو ذرا ذہن میں تازہ کر لیجئے۔ آج کے فوجی حکمران بمشکل پارلیمنٹ میں سادہ اکثریت کی وفاداریاں حاصل کر پائے ہیں۔ کیا یہ ایوب کے عشرے اور ضیاء الحق کے عشرے کی سیاسی صورتحال سے بدرجہا بہتر صورتحال نہیں ہے؟ کوئی اس فرق کو نہ سمجھ سکے تو دوسرے بات ہے لیکن فرق بالکل واضح ہے۔ میں نے اپنے 12 فروری 2004ء کے کالم میں اسی صورتحال کی طرف یوں اشارہ کیا تھا:

''یہ تو ہے جمہوری اقدار سے وابستگی کے حوالے سے ہمارا 56 سالہ ناقابل رشک ریکارڈ لیکن کیا آج بھی بحیثیت مجموعی ہماری سیاسی کلاس کی اہلیت اور استعداد اسی سطح کی ہے جس سطح کی پچھلی نصف صدی میں رہی ہے؟ میرا جواب نفی میں ہے۔ میری دانست میں ہماری سیاسی کلاس کا ایک قابل لحاظ حصہ اب کم از کم اس معیار کی جمہوری قدروں سے وابستگی پیدا کر چکا ہے جس معیار کی ہندوستانی سیاسی کلاس کے اندر پائی جاتی ہے اس لئے اب یہ فرض کرنا ممکن ہو چکا ہے کہ پاکستان میں حقیقی معنوں میں آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کا انعقاد ممکن ہو جائے تو اس پائے کی سیاسی لیڈر شپ منتخب ہو سکتی ہے جس پائے کی لیڈر شپ ہندوستانی انتخابات میں اگلی مئی میں اوپر آئے گی۔ بنابریں میری یہ پختہ رائے ہے کہ پاکستان میں صحیح معنوں میں منصفانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات کا ڈول اب ڈالا جائے تو ہماری جمہوری تاریخ کا ایک نسبتاً روشن باب شروع ہو سکتا ہے۔ اسی لئے میں نے صدر مشرف کے نام اپنے کھلے خط (10 دسمبر 2003ء) میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ جلاوطن سیاستدانوں کو واپس بلا کر قومی امور پر مشاورت کا جو عمل کیا جائے وہاں سے نئے انتخابات کے انعقاد کی تجویز سامنے آئے تو اسے قبول کر لینا چاہئے۔ یاد رکھئے کہ جب تک پاکستان میں کلی طور پر آزادانہ اور منصفانہ انتخاب کا انعقاد نہیں ہوتا اور یہ روایت مستحکم نہیں ہو رہتی پاکستان کو کبھی حقیقی جمہوری ملک تسلیم نہیں کیا جائے گا خواہ کسی ستر ہویں ترمیم کے ذریعے فوجی حکومت کے اقدامات کی توثیق ہی کیوں نہ کر دی جائے۔ کاش جنرل مشرف ایک فرشتہ ہوتے یا کم از کم نیلسن منڈیلا یا ڈیگال یا نہرو ہی کے پائے کے مدبر ہوتے تو میں انہیں تجویز کرتا کہ پاکستان میں کلی طور پر آزادانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات کا راستہ اختیار کریں۔ جن لوگوں کو بھی قانون اور عدلیہ انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت دیں ان کے راستے میں رکاوٹ نہ ڈالی جائے اور ایسے آزاد انتخاب کا نتیجہ کھلے دل اور شرح صدر کے ساتھ قبول کر لیا جائے۔ گمان غالب یہ ہے کہ ایسے انتخاب کے بعد جو سیاسی حکومت بنے گی وہ ماضی کی تمام سیاسی حکومتوں سے جمہوری قدروں سے وابستگی کے حوالے سے یقیناً بہتر ہوگی۔ میرے تجویز کردہ خطوط پر ایک نیا انتخاب ہو جائے تو پاکستان کی جمہوری تاریخ کا ایک نیا اور نسبتاً روشن باب شروع ہو سکتا ہے۔ ایسا ہونا ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر کبھی پاکستان کو ایک جمہوری ملک تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ نصف صدی گزرنے کے بعد تو ہمیں جمہوری بلوغت کے دور میں داخل ہونے کے قابل ہو جانا چاہئے۔''

10/3/06

بینظیر اور نواز شریف کی غلطیاں اپنی جگہ لیکن اب ان سے بہتر جمہوری طرز عمل کی توقع کی جا سکتی ہے۔ میں آپ کو بتاؤں کہ اس وقت میاں نواز شریف اور ان کی پارٹی کا پاکستان کی پوری سیاسی تاریخ کا فہم بدل چکا ہے۔ بہت بہتر اور حقیقت پسندانہ ہو چکا ہے۔ اب انہیں ضیاء الحق سے اپنی وابستگی پر فخر نہیں۔ ان کی پارٹی کے متعدد ترجمان بشمول بیگم کلثوم نواز، جاوید ہاشمی، چوہدری نثار علی خان، خواجہ آصف اور متعدد دوسرے حضرات اپنے سیاسی ماضی سے لاتعلقی کا اظہار کر چکے ہیں بلکہ بعض تو برملا قوم سے معافی مانگ چکے ہیں۔ دلوں کی تبدیلی کی اس سے بڑی شہادت اور کیا ہو سکتی ہے؟ کوئی نہیں کہتا کہ بینظیر اور نواز شریف کی شرکت کی صورت میں جب بھی نئے انتخابات ہوں گے تو پاکستان میں برطانیہ اور فرانس کے پائے کی جمہوریت قائم ہو جائے گی۔ یہ ممکن نہیں لیکن نیا سیاسی دور یقیناً ماضی کے تمام سیاسی ادوار سے کچھ نہ کچھ بہتر ضرور ہوگا اور پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک میں تبدیلی اسی طرح ہی آ سکتی ہے۔ گیلانی صاحب فرماتے ہیں: ''آپ اپنی اہمیت کو سمجھتے ہوئے قوم کو پیشہ ور سیاستدانوں سے اجتناب کا مشورہ دیں''۔ میں اپنی اہمیت کے بارے میں کسی غلط فہمی یا خوش فہمی میں مبتلا نہیں لیکن میں سمجھ نہیں سکا کہ ''پیشہ ور سیاستدانوں'' سے اجتناب کا مشورہ اگر قوم کو دوں تو پھر جمہوریت کے فروغ کے لئے کس سے امیدیں وابستہ کرنے کی تلقین کروں؟ سیاستدان تو پیشہ ور ہی ہوتا ہے۔ کیا ٹونی بلیئر اور بارک شیراک اور جارج بش اور بل کلنٹن کا پیشہ سیاست نہیں ہے؟ ہمیں تو یہ خواہش کرنی چاہئے کہ سیاست کو اوڑھنا بچھونا بنانے والے مزید لوگ سامنے آئیں کہ موجودہ دور میں سیاستدان ہی جمہوری نظام چلا سکتے ہیں۔